© rasailojaraid.com

انتظار حسین

تہذیبی میل جول بذریعہ کہانی

تہذیبیں اپنے اپنے علاقوں میں جنم لیتی ہیں اور پروان چڑھتی ہیں۔ مگر کوئی تہذیب اپنے علاقے میں محصور ہو کر رہ جائے، یہ اسے گوارا نہیں ہوتا۔ ہر تہذیب کے اندر یہ خواہش چھپی ہوتی ہے کہ اپنے علاقہ سے باہر نکل کر دوسری تہذیبوں سے ملے جلے، اُن کے ساتھ لین دین کرے، کچھ اُن سے لے کچھ انہیں دے۔ مگر اس کام کے لیے وہ باہر کے کسی آدمی پر بھروسہ نہیں کرتی۔ سو تہذیبوں کے محافظ اور نام لیوا بالعموم یہ فریضہ انجام نہیں دے پاتے۔ تہذیب کے بطن ہی سے اس کے سفیر برآمد ہوتے ہیں جو یہ کام انجام دیتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک تہذیب کا بہترین اظہار اُس کی شاعری میں ہوتا ہے۔ سو اُس تہذیب کی بہترین سفیر اس کی شاعری ہوتی ہے۔ مگر میں کچھ اور کہنے لگا ہوں۔ بے شک کسی بھی تہذیب کا بہترین اظہار تو اس کی شاعری ہی میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہترین اظہار ہی اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شاعری اُس تہذیب کی زبان کے ساتھ اتنی جڑی ہوئی ہوتی ہے کہ اُسے اُس سے الگ کرنا بہت دشوار ہوتا ہے۔ کسی بھلے نقاد نے شاعری کے ترجمے کے بارے میں کتنی خوب بات کہی ہے کہ شاعری کا ترجمہ کرتے ہوئے جو چیز ترجمہ نہیں ہو پاتی بلکہ ترجمہ کے عمل میں غتر بود ہو جاتی ہے بس وہی شاعری ہوتی ہے۔

سو میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ کسی تہذیب کے بطن سے جنم لینے والی کہانیاں شاعری سے بڑھ کر اُس کی سفیر بن جاتی ہیں۔ شاعری کی مار وہاں تک ہوتی ہے جہاں تک زبان اس کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ دیتی ہے۔ مگر کہانی اپنی پیدائشی زبان کی اس حد تک محتاج نہیں ہوتی۔ جہاں تک زبان اُس کا ساتھ دیتی ہے، وہاں تک ماشاء اللہ، سبحان اللہ۔ اس سے آگے وہ خود اپنی اندرونی طاقت کے زور پر چلتی ہے اور دور تک کا سفر کرتی ہے۔ لوک کہانیوں کا وطیرہ یہی رہا ہے۔ وہ اپنی کہانی پن کے زور پر دُور دُور تک کا سفر کرتی ہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہیں۔ بہت کچھ لٹا کر اور بہت کچھ سمیٹ کر واپس آتی ہیں۔

وہ لوک کہانی بہت نصیبوں والی ہوتی ہے جو کسی اچھے اور سچے شاعر کے تصور میں سما جائے۔ پھر وہ اس کے تخلیقی جوہر کے وسیلہ سے اعلیٰ تخلیقی اظہار کی سطح پر پہنچ جاتی ہے۔ جیسا کہ ہیر رانجھے کی کہانی کے ساتھ ہوا۔ پھر اس کہانی نے وارث شاہ کے شاعرانہ اظہار سے عزت پائی اور اس کے ساتھ دُور تک گئی یعنی وہاں تک جہاں تک پنجابی زبان کی رسائی تھی۔ لکھنؤ میں بیٹھے انشاء اللہ خاں تو ہفت زبان تھے۔ اُنہوں نے تو یہ کہانی وارث شاہ کی زبان ہی میں سنی ہوگی۔ جب ہی تو اُنھوں نے بڑھ چڑھ کر اس قصے کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ پھر یہ کہانی اپنے زور پر آگے بڑھی۔ اُردو کے مثنوی نگار اس کہانی کو لے اُڑے اس واسطے سے کتنی مثنویاں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے تحقیق کر کے بتایا ہے کہ اُردو میں یہ کہانی چھ مثنویوں کا موضوع بنی ہے۔ آٹھ کی تعداد میں نثری قصے کے طور پر اسے قلمبند کیا گیا ہے۔ ان مثنویوں اور نثری قصوں کے عمل ہی میں اس کے مرکزی کردار ہیر اور رانجھا استعارے، تشبیہ کا روپ دھار کر اُردو غزل میں نفوذ کر گئے۔ جہاں تہاں سے کچھ شعر سنیے۔ سراج اورنگ آبادی کہتے ہیں:

مشتاق ہوں میں تیری فصاحت کا ولیکن
رانجھا کے نصیبوں میں کہاں ہیر کی آواز

نظیر اکبر آبادی کو سنیے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مَیں تو صفِ محشر میں بھی لوں گا تجھے پہچان
رانجھا کو نہ بھولے گا کبھی ہیر کا نقشہ

اکبر نے یوں کہا

سن کے میری سرگزشت احباب یہ کہنے لگے
بحر کا قصہ بھی افسانہ ہے رانجھے ہیر کا

نظیر اکبرآبادی نے ککڑی کی کیا خوب تعریف کی تھی کہ:

لیلیٰ کی انگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں

مگر دوسرے موقعہ پر آگرہ کی ککڑوں کی تعریف کرتے ہوئے اس شاعر کو ہیر رانجھا یاد آ گئے۔ بل کھائی ہوئی ککڑیوں کو اس نے ہیر کی چوڑیاں جانا اور لمبی ستواں ککڑی کو یوں بیان کیا:

ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے
سیدھی ہے سو وہ پیارو رانجھا کی بانسری ہے
کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی ہے

تو یوں سمجھیے کہ نظیر کی فہرستِ عاشقاں میں پہلا نمبر لیلیٰ مجنوں کا، دوسرا نمبر ہیر رانجھے کا۔

ویسے تو سسی پنوں کی داستانِ محبت پر بھی مثنویاں کچھ کم تعداد میں نہیں لکھی گئی ہیں (اس کی تفصیل آپ کو نارنگ صاحب بتائیں گے) اور ان میں زیادہ معیاری مثنوی وہ تسلیم کی گئی جو جرأت کے شاگرد نواب محبت خاں نے لکھی تھی۔ لیکن سسی پنوں کو وہ درجہ نہیں ملا کہ غزل میں لیلیٰ مجنوں کی صف میں شمار ہوتے۔

مگر لوک کہانیوں کا ایک وہ سلسلہ بھی تو ہے جو اپنی مقبولیت کے لیے کسی شاعر کی نظرِ کرم کا محتاج نہیں اور جن میں سرِفہرست راجہ رسالو کا قصہ ہے۔ راجہ رسالو کا قصہ پڑھتے پڑھتے مَیں چونکا کہ ارے یہ راجہ رسالو کا جو طوطا ہے یہ تو فسانۂ عجائب والے جانِ عالم کے طوطے کا بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔ یہ دونوں طوطے ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں لیکن اپنے اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شہزادے کے اسی ایک طرح معاون مشیر اور گائیڈ بنے ہوئے ہیں۔ آخر اُن کا میل کب، کہاں اور کیسے ہوا؟ اور راجہ رسالو کا بڑا بھائی پورن بھگت۔ اس کی کہانی تو مہاراجہ اشوک کے بیٹے کنال سے اتنی ملتی جلتی ہے کہ دونوں جڑواں بھائی نظر آتے ہیں۔ مگر خیر کنال کا واقعہ جس نگر میں گزرا وہ سیالکوٹ سے بہت زیادہ دُور نہیں ہے۔ تکشیلا میں جسے اب ہم ٹیکسلا کہتے ہیں، وہ سوتیلی ماں تھی جو راجکمار کنال پر ریجھ گئی تھی اور جب اس پاکباز راجکمار نے اس کے دام میں پھنسنے سے انکار کر دیا تو اسے یہ سزا ملی کہ اس کی آنکھیں نکلوائی گئیں۔ اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ کہاں ٹیکسلا اور سیالکوٹ اور کہاں یوپی میں اپنی چھوٹی سی بستی۔ یہ کہانی بھیس بدل کر وہاں کیسے پہنچ گئی۔ مگر مَیں نے بچپن میں جو کہانی سنی تھی، اُس میں ایک تفصیل ایسی تھی جو ٹیکسلا والی کہانی میں نہیں ہے۔ مگر مَیں نے اس تفصیل کی معنویت کو اسی ٹیکسلا والی کہانی کے حوالے سے جانا۔ مَیں نے جو کہانی سنی تھی اُس میں سوتیلی ماں راجکمار کی آنکھیں نکلوانے پر قناعت نہیں کرتی بلکہ باندیوں کو حکم دیتی ہے کہ ان دیدوں کو میرے تلووں پہ ملو۔ اور کہتے ہیں کہ کنال کی آنکھیں بہت قیامت تھیں۔ اور اس علاقے میں ایک پرندہ تھا، کنال نام کا، اس کی آنکھیں بہت خوبصورت ہوتی تھیں۔ اسی حوالے سے اس راجکمار کا نام کنال پڑ گیا تھا۔ جب مَیں نے اس کہانی سے جوڑ کر اپنی بچپن کی سنی ہوئی کہانی کو یاد کیا تو اُس کی تفصیل میں خود بخود ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی۔

لوک کہانیاں پڑھتے جائیے اور ایسی مشابہتیں دریافت کرتے چلے جائیے۔ اور یہ ہونا ہی تھا۔ کہانیاں طبعاً آوارہ گرد ہوتی ہیں۔ لاکھ اُن کا علاقے سے رشتہ جوڑو، اپنے علاقے میں ٹکتی نہیں۔ آوارہ پھرتی رہتی ہیں۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہیں۔ اور کس مزے سے ایک ایک تہذیب کے علاقے سے نکل کر کسی بھی دوسرے علاقے، دوسری تہذیب میں رچ بس جاتی ہیں۔ اور پتہ نہیں ہو سکتیں کہ جس علاقے سے نکل کر جس علاقے میں آن بسی ہیں، ان میں آپس میں کتنی کٹا چھنی ہے۔ تہذیبوں کا میل ملاپ جتنے بڑے پیمانے پر کہانیوں کی سطح پر ہوتا رہا ہے، اتنا شاید کسی اور سطح پر کسی اور حوالے سے نہیں ہو پایا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مگر تہذیبوں کا ایسا میل ملاپ ہی تو ہمیں زیادہ خوفزدہ کرتا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ آئے دن شور اُٹھتا ہے کہ پاکستان پر ثقافتی حملہ ہو گیا۔ اغیار کی طرف سے ثقافتی یلغار کا اندیشہ ہمیں مستقل پریشان رکھتا ہے۔ کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ ہم بحیثیت قوم ایک تہذیبی خوف کی صورتِ حال میں گرفتار ہیں۔

شاید قومی تہذیب اور علاقائی تہذیبوں کے حوالے سے ہم اندیشوں کا شکار بعد میں ہوئے۔ ایسے خوف کا آغاز ہمارے یہاں مذہب کے حوالے سے ہوا۔ اس برصغیر میں شاید اپنی تاریخ کے ابتدائی مرحلوں ہی میں راسخ العقیدہ علماءِ دین کے یہاں یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ ظلمت کدۂ ہند میں پہنچ کر ہمارا اسلام خالص اسلام نہیں رہا ہے۔ صوفیا نے دوسرے مسلک دانوں کے سلسلے میں جو وسیع القلبی برتنی شروع کر رکھی تھی، اُس نے اُن کے اس اندیشہ کو اور تقویت پہنچائی۔ اُن میں سے کسی نے یہ نہیں سوچا کہ مسلمانوں کی آمد کے بعد اس سرزمین پر کوئی نیا تہذیبی عمل تو شروع ہونا ہی تھا۔ اس عمل میں اسلام نے ہندی تہذیب اور فکر کو جس وسیع پیمانے پر متاثر کیا، اُس کا جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر تارا چند کو پوری کتاب لکھنی پڑی۔ مگر کوئی بھی تہذیبی عمل یکطرفہ تو نہیں ہوتا۔ عموماً دوطرفہ ہوتا ہے۔ اور یہ کیوں فرض کیا جائے کہ اس دوطرفہ عمل میں اسلام دب کر رہ جائے گا۔ عجب بات ہے کہ ایک طرف یار اسلام کی حقانیت پر اپنے یقین کا مظاہرہ کرتے ہیں اور دوسری طرف ان کے اندر یہ خوف پل رہا ہے کہ تہذیبی یا فکری سطح پر کوئی چیلنج آنے پر اسلام اُس کا مقابلہ نہیں کر پائے گا۔

تو اب ایسی سوچ رکھنے والے حضرات اس سوال سے دوچار ہیں کہ اسلام کو اس خطرے سے کیسے بچایا جائے اور مسلمانوں کے طور اطوار میں ثقافتی، سماجی رویوں میں جو 'کفر' در آیا ہے، اُس کا اخراج کیسے کیا جائے۔ اُن کے تصور کے مطابق خود اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب اپنے زور پر اس 'ثقافتی یلغار' کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر خود ان میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اس یلغار کو دفع کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کسی تہذیبی عمل میں پہیہ اُلٹا تو نہیں گھمایا جا سکتا۔ پھر کیا کیا جائے؟ وہی پرانا نسخہ جبر و تشدد والا۔ اس نسخہ نے آج کے مسلمان معاشرہ میں ایک نئی مخلوق کو جنم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا ہے جس نے دہشت گرد کا لقب پا کر اپنا لوہا منوایا ہے۔اپنا لوہا تو خیر اُس نے منوالیا، مگر مقصود تو اُن کا یہ تھا کہ اسلام کی طاقت کو منوایا جائے۔مگر یہ تو ایسا نسخہ ہے کہ نہ مرض رہے نہ رہے مریض۔لڑکیوں کے سکول جلانے سے، حجاموں کے استرے پر پابندی لگانے سے، ٹی وی سیٹوں، فلمی گانوں کے کیسٹوں اور وڈیوز کو نذرِ آتش کرنے سے کیا تہذیبی تطہیر ہو جائے گی۔ ہاں تہذیبی خودکشی کا یہ آسان راستہ ضرور ہے۔اگر ان جہادیوں کی ایجاد کردہ تہذیبی خودکشی کے نسخہ ہی میں اُن کے ہمدردوں اور حامیوں کو اسلام کی فلاح نظر آتی ہے تو یہ الگ بات ہے۔

© rasailojaraid.com